اکیسویں صدی، روشن آنکھیں اور جمیل جالبی

ڈاکٹر ذکیہ رانی،
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو جامعہ،
کراچی، پاکستان

ڈاکٹر جمیل جالبی اٹھارہ برس کی عمر میں ۱۳/اگست ۱۹۴۷ء کو میرٹھ سے پاکستان ہجرت کر آئے تھے۔(۱) سن ۱۹۴۷ء ہی وہ سال ہے جس میں جالبی پاکستانی اور مصنف قرار پائے۔ بالحاظِ ذہانت وفطانت وہ نوعمری ہی سے یونانیوں کی فکر جیسے جرثومے رکھتے ہوں گے اگر ہندوستان میں خورشید الاسلام جیسا یونانی ہوسکتا ہے تو پھر یونانیوں سے تدبر کا حامل نوجوان بھی ہوسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ جالبی صاحب میں ان کی اٹھان ہی سے فکری بصیرت کی جستجو پائی جاتی تھی۔ ابتداء ہی سے جالبی صاحب پڑھاکو مشہور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اس وقت کراچی کے جید دانشور ادیبوں کے نا صرف منظورِ نظر ہوگئے بلکہ ادب اور سماج کے رشتوں کو بھی باہم کرنے کی آرزو میں مبتلا ہوگئے۔ پاکستان آنے کے بعد مطالعہ اور تعلیم کا سفر جاری رہا۔ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے ایم۔اے انگریزی، ۱۹۵۰ء میں ایم۔اے اردو پھر ایل۔ایل۔بی کیا۔ ۱۹۵۳ء میں سول سروس کا امتحان پاس کیا اور انکم ٹیکس کے محکمہ سے منسلک ہوئے بعدازاں ۱۹۷۱ء میں پی ایچ۔ڈی اردو ہوگئے۔ ۱۹۷۶ء میں ڈی۔لٹ کیا اور ۱۹۸۸ء میں ڈی۔ایس۔سی کی اعزازی سند پائی۔(۲) عموماً بیوروکریسی اختیار کا حامل بنا دیتی ہے اور علم وفضل سے دور کر دیتی ہے۔ جالبی صاحب کے ساتھ اس اختیار نے عجب روپ دھارا کہ نوعمری کی ادبی وعلمی نوعیت نے ایسی چھب دکھلائی کہ جس سے تا حال ادبی دنیا منوّر رہے۔

جمیل جالبی کے ڈاکٹر ہونے تک یہ طے ہوچکا تھا کہ موصوف کا خاص میدان تحقیق ہے۔ ڈاکٹر صاحب یکم ستمبر ۱۹۸۳ء کو وائس چانسلر، جامعہ کراچی کی ذمہ داریوں سے بہرہ مند

ہوئے۔(۳)اس وقت جالبی صاحب چوّن برس کے تھے۔سنِ شعور سے اس عمر تک علم وادب ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔شیخ الجامعہ کی ذمہ داریوں کے بعد لکھنے پڑھنے میں کوئی فرق آتا بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا۔اسی دوران انھوں نے اردو تنقید کا منشور تحریر کیا۔کاش اس منشور پر تمام حلقۂ علم وادب میں مکالمہ کیا جاتا اوراس نئی تنقید کے حامل منشور پر اس انداز سے عمل کیا جاتا کہ ادب پاکستانی معاشرے کو ایسی اکائی میں بدل دیتا کہ جو ہر سطح پر مثالی قرار پاتی۔جالبی صاحب نے جب یہ منشور تجویز کیا تھا اس وقت ادبی گروہ بندی کا احوال پچاس ساٹھ گروہوں سے تعبیر کیا جا سکتا تھا لیکن آج ہزار ہا گروہ اس انداز سے کام کر رہے ہیں کہ ہر فرد ایک گروہ ہو چکا ہے۔موجودہ دنیا بالخصوص پاکستانی معاشرے کو آج 'نئی تنقید' کے منشور کی زیادہ ضرورت ہے۔کہ کسی طور بکھری ہوئی اکائی یکجا ہونے کے آثار پیدا ہوں۔اس درجہ اہمیت کی حامل نئی تنقید کے حوالے سے جالبی صاحب کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو:

> ''ادب زندگی کی روح کا اظہار ہے۔زندگی ہی ادب کا خام مواد ہے۔اس لیے ان رجحانات کی نفی کرنا اوران کے بجائے مثبت رجحانات اور رویوں کو آگے بڑھانا بھی آج تنقید کا کام ہے۔گویا اس پیغمبری وقت میں تنقید کا ایک کام تو یہ ہے:
>
> (۱) کہ وہ ان بیماریوں کو سامنے لائے جو غلط اقدار کو اختیار کرنے سے ہماری اجتماعی زندگی میں پیدا ہو گئی ہیں۔
>
> (۲) دوسرے ان بیماریوں کی الگ الگ تشخیص کر کے ان کا علاج دریافت کرنا بھی تنقید کا کام ہے۔
>
> (۳) تیسرے اپنی تاریخ ،اپنی روایت کے حوالے سے ان بنیادوں کو تلاش کرنا بھی تنقید

کا کام ہے جن پر نئے نظامِ خیال کی عمارت تعمیر کی
جاسکتی ہے۔

گویا نئی تنقید کو اس وقت دو سطحوں پر کام
کرنا ہے۔ایک ''فکر'' کی سطح پر اور دوسرے ''ادب''
کی سطح پر۔''(۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید کے ذریعے سماج کی تطہیر کرنا چاہتے تھے۔ان کے اس منشور میں معاصر ادبی منظر نامہ دکھائی دیتا ہے ۔ جب تخلیق اور تنقید کا تعلق منقطع ہوا تو ادب اور سماج کا رشتہ براہِ راست متاثر ہوا۔اس کے اسباب

مطالعہ کی کمی اور مغربی علوم کے تراجم جو ادبی شعور میں پختگی پیدا کرنے کے پیروی کا سبب بن رہے تھے۔مغربی علوم کی اندھی تقلید نے ادب کو سماج کا آئینہ بننے سے روک دیا۔اسی ضمن میں انھوں نے فکری اور ادبی سطح پر نئی تنقید کا لائحہ عمل سترہ نکات میں پیش کیا۔ملاحظہ کیجیے۔

(۱) نئی تنقید کے دائرے کو صرف ادب
تک محدود نہ کیا جائے بلکہ اسے پوری زندگی پر پھیلایا
جائے تاکہ تجزیے،مطالعے اور غور وفکر کے
بعد فکر واحساس کی جڑیں صحیح قسم کی زندگی میں تلاش کی
جاسکیں۔صحیح قسم کی زندگی سے مراد وہ نظام اقدار
ومعیار ہے جس کے حوالے سے معاشرے کی اجتماعی
زندگی میں ایسی روح پھونکی جاسکے کہ تخلیقی جوہر زندگی
کے ہر شعبے میں نشوونما پانے لگے۔تخلیقی جوہر
ہر معاشرے کی حقیقی زندگی کے لیے وہی کام کرتا ہے
جو جسم میں روح کرتی ہے۔

(۲) تنقید ہر طرح کے سوالات
اٹھائے،سوال اٹھانا بذاتِ خود اتنا ہی اہم ہے جتنا

ان کا جواب تلاش کرنا۔سوال ہی سے فکر کی سمت اور جواب کی تلاش کا عمل شروع ہوتا ہے۔

(۳)فرد اور معاشرے میں تنقیدی روح کو بیدار رکھنا اور تحمّل سے دوسروں کے نقطہ نظر کو سننا،اس پر غور کرنا اور ذہنی دیانتداری کے ساتھ اس کا جواب دینا تا کہ زندگی کی روح پھیل سکے۔سقراط نے کہا تھا کہ''بے تنقید زندگی گزارنا کتنا دشوار کام ہے؟'' تنقید کا کام اپنے دور کی روح کو دریافت کرنا اور اس میں نئے معنی شامل کرنا ہے۔

(۴)معاشرتی زندگی کو ہر قسم کے جبر وسفّا کی سے پاک کرنا تا کہ بات کہنے کا خوف دل میں باقی نہ رہے۔

(۵)قومی تشخص کی دریافت کے لیے قومی ورثے کی جڑوں کو اجتماعی،قومی وملّی تاریخ میں تلاش کرنا اور ان جڑوں کے رشتوں کو اپنے معاشرے کے فکر واحساس سے جوڑنا۔لوک ورثہ اور سینہ بہ سینہ پہنچنے والی روایات بھی اس سلسلے میں اہمیت رکھتی ہیں۔اپنے ماضی کو اپنی نسل کے لیے دریافت کرنا اور اسے تخلیقی قوتوں کی نشو ونما میں شامل کرنا۔ماضی کو رد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ قوم نے اپنا حافظہ کھو دیا ہے۔

(۶)ان منفی اقدار کے خلاف علَمِ جہاد بلند کرنا جو اجتماعی زندگی میں ناسور بن گئی ہیں اور جن

میں زر پرستی ،معاشی ومعاشرتی عدم مساوات ،ناانصافیاں ،جبر اور آزادیِ اظہار پر بے جا بندشیں شامل ہیں۔

(۷)اپنے معاشرے کے مرکزی وبنیادی مسائل کو متعین کرنا اور معروضی وحقیقت پسندانہ انداز سے ان کا جائزہ لے کر ان میں ربط وسمت پیدا کرنا۔

(۸)معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان ثنویت کے وجوہ تلاش کرنا اور اس تضاد و ثنویت کو دور کرنے کے لیے ایسا تعلیمی ومعاشی نظام دریافت کرنا جو طبقاتی فرق اور عدم مساوات کو ختم کر کے زندگی میں سب کے لیے یکساں مواقع فراہم کردے۔تعلیم ومعاش دونوں اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔ہماری نئی نسل جو احساسِ محرومی کا شکار ہے ،اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم اور ہمارا نظامِ معاش ایک دوسرے کو رد کر رہے ہیں۔

(۹)جدید سائنس نے کائنات میں انسان کے مقام کو ایک نیا رخ اور نیا رنگ دیا ہے۔ صنعت وٹیکنولوجی کی کامیابیوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ سائنس کو پابہ زنجیر نہیں کیا جا سکتا۔کیا ہم سائنس کو کسی ایسے تصورِ حقیقت اور نظامِ خیال کے تحت لا سکتے ہیں کہ سائنس وٹیکنولوجی نظامِ اخلاق کی پابند ہو کر انسان کو تباہی سے بچا سکے۔؟

(۱۰)ادب اورفکرکارشتہ پورے طور پرزندگی سے جوڑنااوراسے واضح کرنا۔بندمعاشرے کے دروازوں کوکھول کرجدیددنیا سے اس کے معنوی رشتے دریافت کرنا تاکہ تازہ ہواکے جھونکوں سے جامدزندگی متحرک ہوکرآگے بڑھ سکے۔

(۱۱)تنقید کا کام یہ بھی ہے کہ وہ ادب پاروں کا تجزیہ ،مطالعہ اورتشریح کرے۔مثبت رجحانات کواُبھارے۔ادب پاروں کے اسالیب،ساخت،تکنیک،جمالیاتی احساس اورتجربوں پر روشنی ڈالے۔انفرادیت کوجوادب کی بنیادی خصوصیت ہے نمایاں کرے۔تقابلی مطالعے سے ادب پاروں کادرجہ متعین کرے۔معاصرادب کے منفی رجحانات کورد کرے اورمثبت رجحانات کومنطقی ترتیب سے ایک جہت دے۔معاصرادب سے نئی تنقید کا گہرااور براہ راست رشتہ قائم رہناچاہیے تاکہ تخلیقی قوتوں کوسرگرم عمل رکھا جاسکے۔اس کے لیے سارے تخلیقی ادب کو پڑھنے ،سمجھنے اورتجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱۲)نئی تنقید کاایک بنیادی کام یہ ہے کہ وہ دنیاکے دوسرے ادبیات کی اہم تخلیقات کواپنی زبان میں منتقل کرے تاکہ نئی امتزاجی قوت سے تخلیقی توانائی کی مسلسل نشوونما ہوتی رہے اورمعاصرادب

کلیشوں (CLICHES) کے قبرستان میں دفن ہوکر نہ رہ جائے۔

(۱۳)قدیم ادب کا پہلے اس کے اپنے دوراور پھر معاصر دور کے حوالے سے مطالعہ کرنا تا کہ اس کی قدر و قیمت اور صحیح اہمیت متعین کی جا سکے۔ان اثرات کی تاریخ کا مطالعہ جو قدیم ادب سے ہمارے معاصر ادب میں شامل ہوئے ہیں۔ادب کی نئی بصیرت حاصل کرنے کے لیے غیر ادبی مآخذ اور مختلف علوم سے استفادہ بھی ضروری ہے۔

(۱۴)اب تک ہمارے نقاد،تحقیق اور ادب کے مربوط مطالعے کے بغیر ایسی کلیّہ سازی اور تعمیم کرتے آئے ہیں جو فی الحقیقت بے بنیاد ہیں۔نئی تنقید کو تحقیق پر اپنی عمارت کھڑی کرنی ہے۔ایز را پاؤنڈ کا''اسکالر کریٹک'' ہی نئی تنقید کا منصب پورا کر سکتا ہے۔

(۱۵)اب تک ہمارے نقاد سنی سنائی بات،کسی دوسرے مصنف کے جملے یا کسی کتاب میں پڑھے ہوئے فقروں کو اصل الفاظ کے ساتھ اقتباس کیے بغیر ہی اپنے لفظوں میں لکھ دیتے ہیں اور پھر اس پر اپنی بات کی دیوار اٹھا دیتے ہیں۔نئی تنقید کے نزدیک یہ عمل ذہنی غیر دیانتداری کے مترادف ہے۔جس مصنف کا جملہ یا قول نقل کیا جائے اس کے الفاظ کو واوین میں لکھا جائے اور یہ بھی بتایا جائے

کہ یہ جملہ کس کتاب میں کس صفحہ پر آیا ہے۔

(۱۶)اچھی نثر تخلیقی عمل ہے اور تنقید کی اچھی اور صاف نثر میں لکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔نئی تنقید کو اسالیبِ نثر،جملوں کی ساخت اور لہجوں کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔اسالیب کو نہ صرف ادب پاروں میں بلکہ دوسرے علوم کی کتابوں میں بھی تلاش کرنا چاہیے تا کہ اچھی نثر لکھنے کی روایت قائم کی جا سکے۔نثری تخلیقات مثلاً ناول،افسانہ،ڈرامہ وغیرہ کے تنقیدی مطالعے کو بھی وہی اہمیت دی جائے جو اَب تک شاعری کو دی جاتی رہی ہے۔شاعری میں بھی غزل کے مطالعے تو ہمارے ہاں ہوئے ہیں لیکن اب طویل نظموں اور شاعری کی دوسری اصناف کو بھی یکساں اہمیت دینی چاہیے۔ادب اور ادیبوں کا مطالعہ،اصناف ومسائل کا تجزیہ،مختلف تخلیقاتِ نظم ونثر کی تشریح تنقید کا ایک کام ہے اور یہ مسلسل کیا جانا چاہیے۔

(۱۷)نئی تنقید چونکہ امتزاجی مزاج کی حامل ہوگی اس لیے اس سطح کو بھی اسے تلاش ودریافت کرنا ہے جس پر یہ امتزاج ممکن ہو سکے۔

نئی تنقید کے اس خاکے کو،جسے جدید وبین الاقوامی اصطلاح میں 'مینی فیسٹو' کہہ سکتے ہیں، پورے طور پر بروئے کار لانا یقیناً کسی ایک فرد کی ذہنی وجسمانی قوت سے باہر ہے۔لیکن کام کا

آغاز ہی اس کا انجام ہے۔آیئے ہم سب مل کر اس
کام کا آغاز کریں۔ ''(۵)

مینی فیسٹو یا منشور کے مذکورہ سترہ نکات جالبی صاحب کی ناقدانہ بصیرت پر دلالت کرتے ہیں۔احسن فاروقی نے اپنے مضمون میں مولانا محمد حسین آزاد کو نقل کیا ہے کہ نقاد کی دونوں آنکھیں روشن ہونی چاہئیں۔(۶)اس حوالے سے بنیادی بات یہ طے کردی کہ تنقید نگار کو یک رُخا نہیں ہونا چاہیے۔مشرق اور مغرب دونوں ہی سرچشموں سے کسبِ فیض کا حامل صحیح معنوں میں تنقید نگار کہلانے کا مستحق ہے۔جالبی صاحب کی دونوں آنکھیں روشن تھیں۔یہی سبب ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی کے ربع آخر میں سترہ نکات کی صورت وہ سوالات اٹھائے کہ جن سے تنقید نگار کی منصبی ذمہ داریاں پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔جب کسی معاشرے میں ادب غیر مؤثر ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ معاشرہ اپنے کلچر سے دور کہیں سانس لے رہا ہے۔جالبی صاحب نے مذکورہ سترہ نکات میں ایک ایسی مثلث کو تشکیل کیا ہے کہ جس کے بغیر مثالی معاشرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔اس مثلث میں ادب کو زاویہ قائمہ بناتے ہوئے وتر کو فکر سے نسبت دی جاتی ہے جبکہ قائمہ کا انحصار کلچر پر ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ادب کسی نہ کسی کلچر کا نمائندہ اور فکر کا ترجمان ہوتا ہے اور یہ ترجمانی کسی نہ کسی مکان یا اسپیس کی حامل ہوتی ہے اور یہ سب زمان (Time) کے ذریعے جانا اور سمجھا جاتا ہے۔یہاں جالبی صاحب ادب اور فکر کو عصر یا زمان سے جوڑ دیتے ہیں جبکہ اس سارے عمل کی بنیاد کلچر بنتی ہے۔کلچر کے دھارے براہِ راست تہذیب سے جڑ جاتے ہیں۔اسی لیے بآسانی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فن کے پیچھے تہذیبی اقدار کا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔اگر کوئی اظہار ان اقدار سے عاری ہو جائے تو یقیناً یہ اظہار معاشرے پر اثر انداز نہیں ہوگا۔سینتیس برس قبل ترتیب دیئے گئے یہ نکات دراصل پاکستانی معاشرے کی بازیافت سے جڑے ہوئے ہیں۔مجموعی اعتبار سے نئی تنقید تہذیبی تشخص کو ادب اور فکر میں تلاش کرنے کا نام ہے۔اکیسویں صدی میں جالبی صاحب کی روشن آنکھیں اطراف و اکناف میں تہذیبی تشخص کی جستجو میں تا حال مبتلا ہیں اور ہم ایک آنکھ سے دیکھنے والے انگریزی (۷) کے بغیر تنقید کو لاحاصل سمجھ رہے ہیں۔

☆☆☆